جدید اُردو تنقید اور جدید مغربی تنقید
(چند معروضات)

ڈاکٹر قاضی عابد*

Abstract:
This paper presents an argument about why modern trends of literary criticism have not taken roots in Urdu. It begins by highlighting the fact that the subject of Linguistics and premises of Modern Philosophy have not been properly introduced in Urdu. Therefore the modern trends of criticism developed in these disciplines have not found a way in the mainstream of Urdu literary or critical traditions. Hence even though the new criticism in Urdu is loaded with the names of De Saussure, Levi Strauss, Roland Barthes, Jonathan Culler, Derrida, Lacan, Terry Eagelton etc., the ideas of modern critical theory have neither been properly understood, nor propagated and absorbed in Urdu. Also these names have been used by modern Urdu critics merely to project and promote their own narrow ideologues. The effort to popularise their views has not succeeded merely because it has not been seriously made at all. Consequently, any reference to these theories appears to be merely a cheap trick to win attention or superficial at beast.

یہ بات ایک مسلمہ امر کا درجہ رکھتی ہے کہ اُردو تنقید پر مغربی تنقید کا اثر اور انجذاب مولانا الطاف حسین حالی (مقدمہ شعروشاعری:۱۸۹۳ء) سے شروع ہوتا ہے۔اس اثر وانجذاب کی ایک قابلِ فہم صورت مولانا حالی سے لے کر وجودیت کی تحریک تک ایک واضح عمل کی طرح روشن نظر آتی ہے۔حالی کے اصلاحی نظریات، رومانوی اندازِ نقد، مارکسی جمالیات،نفسیاتی شعور اور وجودی فکر اُردو تنقید کے روشن تناظر بنتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائیاں مغربی اندازِ فکر میں بنیادی تبدیلیوں کی دہائیاں ہیں جب روسی ہیئت پسندی، نشانیات، ساختیات اور بعدازاں مابعد ساختیات اور مابعد جدیدیت کے مباحث نے پرانے تنقیدی نظریات، رجحانات، رویوں اور طریق کار کو تقریباً پیش پاافتادہ اور فرسودہ قرار دے دیا۔ان دہائیوں میں مغرب کی تنقیدی لغت یکسر تبدیلی ہوگئی۔اُردو میں ان تبدیلیوں کے آثار واضح انداز میں نوے کی دہائی میں دکھائی دینے شروع ہوئے۔ اگرچہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی (۱۹۷۶ء)، ڈاکٹر سلیم اختر (۱۹۷۸ء)، محمد حسن عسکری (۱۹۷۹ء) اور مظفر علی سید (۱۹۸۵ء) نے اپنے کچھ

* اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

مضامین/مصاحبہ میں اس نئے تنقیدی تناظر سے آشنائی کا ثبوت دیا۔نوے کی دہائی کے آغاز یا اس سے دو ایک سال قبل اُردو کے معروف ناقدین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر وزیر آغا نے ان مباحث کو مکمل انہاک کے ساتھ اپنی تنقید کا محور و مرکز بنا لیا۔ پھر تو گویا دبستان ہی کھلتا چلا گیا۔''اوراق''،''صریر''، ''دریافت''،''ذہنِ جدید'' اور ''استعارہ'' کے صفحات ساختیاتی لسانی مباحث کے لیے وقف نظر آنے لگے۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ اُردو کے ناقدین کا قلم سوسیور، لیوی سٹراس، رولاں بارتھے، جوناتھن کلر، دریدا، لاکاں، ٹیری ایگلٹن، ساختی لسانیات، نشانیات، ساختیات، ردتشکیل، دال، مدلول، لانگ، پیرول، ڈس کورس، متن، ارادی معنویت اور افتراق والتوا وغیرہ کے علاوہ کچھ لکھنا ہی بھول گیا ہے لیکن اس سب کے باوجود یہ جدید تنقیدی رجحانات اُردو تنقید کا وہ روشن اور بصیرت افروز باب نہ بن سکے جو ادب کے حوالے سے ادب کے عام/خاص قاری کے اندر روشنی پیدا کرتا۔ بھاری بھرکم اصطلاحوں کے بوجھ سے ہلکان یہ نئی تنقید اس طرح سے ہماری تنقیدی روایت کا حصہ نہ بن سکی جس طرح سے مولانا حالی سے وجودی فکر تک مغربی انداز نقد ہمارے ادبی منظر نامے کو اجالنے کا ایک وسیلہ بنا تھا۔اس صورت حال کو مغربی فکر سے ایک گہرے رمز شناس نقاد نظیر صدیقی نے انہی جدید رویوں پر مضمون لکھتے ہوئے یوں واضح کیا ہے:

> ''عام قارئین سے قطع نظر شعروادب کی دنیا، شعروادب کے عام اساتذہ اور ناقدین کے لیے بھی پریشان کن بن چکی ہے۔ان کا سمجھ میں نہیں آتا کہ نئے ادبی نظریات کے ہنگامے کیا معنی رکھتے ہیں۔ ساختیاتی تنقید کیا بلا ہے۔ مابعد ساختیات کیا چیز ہے۔ ردتشکیل کا آواگون کیا مفہوم رکھتا ہے۔فیمنسٹ تنقید کس قسم کا دردِسر یا کس قسم کے دردِسر کا علاج ہے وغیرہ وغیرہ۔''(۱)

نظیر صدیقی کی یہ رائے قطعاً مبالغے کی حامل نہیں ہے۔ جدید مغربی تنقید کا اُردو پر جو بھی اثر ہے وہ اوپر سے اوڑھا ہوا لگتا ہے۔اُردو تنقید ان نظریات کو پوری طرح اپنا جزو بدن نہیں بنا سکی یا ان نظریات کو صحیح طریقے سے ہضم نہیں کر سکی۔اس بات کا لاشعوری احساس اُردو میں ان تنقیدی نظریات کے بنیاد گزاروں کو بھی ہے، چنانچہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''بعض کرم فرما ہر کام میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ یہ بھی مبارک کام ہے لیکن کچھ لوگ سرے سے ہاتھ اُٹھا دیتے ہیں کہ ہماری تو سمجھ میں

> نہیں آتا۔ یوں وہ اختلاف کرنے کے حق سے بھی خود کو محروم کر دیتے ہیں کیونکہ اختلاف کرنے کے لیے بھی بات کا سمجھنا شرط ہے۔۔۔ادورنو نے ایسے لوگوں کے لیے کہا تھا:
>
> They offer the shamelessly modest assertion that they do not understand. This eliminates even opposition, their last negative relationship with truth.
>
> ایسے لوگ اصلاً ہمدردی کے مستحق ہیں کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ اس سے نقصان ڈسکورس کا نہیں خود انہیں کا ہے۔'' (۲)

طنز یا تعریض کا یہ رویہ ان تنقیدی مباحث کی تفہیم میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ساری صورتحال کا تجزیہ کیا جائے جس کی طرف نظیر صدیقی نے توجہ دلائی ہے۔ ذیل کی سطور میں ان اسباب اور محرکات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی جن کی وجہ سے یہ جدید تنقیدی نظریات اتنا کچھ لکھا جانے کے باوجود اپنی تفہیم میں زیادہ بامراد نہیں ہو سکے۔

۱۔ زیادہ تر جدید تنقیدی نظریات کی اساس جدید لسانیات پر اُستوار ہوئی ہے جسے اب ساختیاتی لسانیات کہا جاتا ہے اور جس کے بنیاد گزار سوئس ماہر لسانیات فرڈی نیڈ ڈی سوسیور تھے۔ اُردو میں لسانیات کا یہ ''یک زمانی مطالعہ'' جو مذکورہ سوئس ماہر لسانیات کا لسانیات کی دنیا میں ایک اہم کارنامہ ہے، اپنی روایت تشکیل نہیں دے سکا۔ اُردو لسانیات کے اہم کارگزار اُردو زبان کے آغاز کے نظریات کی کھائی میں دادِ تحقیق میں مصروف رہے ہیں۔ یوں حافظ محمود شیرانی سے لے کر ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر سہیل بخاری اور عین الحق فرید کوٹی کی بصیرتیں ایک کارِ لاحاصل میں صرف ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور پروفیسر خلیل صدیقی نے لسانیات عامہ کے فروغ کے لیے یقیناً کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور اُردو میں لسانیات کی روایت کو مضبوط کرنے کی بھرپور سعی کی لیکن ان علماء میں سے بھی کسی نے ساختیاتی لسانیات کی طرف توجہ نہ کی۔ یوں جب جدید مغربی تنقیدی نظریات اُردو دنیا سے روشناس ہوئے تو یہاں ان کی نشوونما کے لیے نرم زمین موجود نہ تھی۔ اس لیے جب آج کوئی ساختیاتی نقاد یک زمانی/دوزمانی (Synchronic / Diachronic) نظام اور کلام (Langue & Parole) یا دال اور مدلول (Signifire / Signified) کی بات کرتا ہے تو اُردو ادب کا عام

قاری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔

۲۔ زیادہ تر جدید ناقدین دریدا، لاکاں، فوکو، یا پھر جدید تنقید کے لیے پس منظر مہیا کرنے والے علماء لیوی سٹراس وغیرہ ادب کی بجائے دیگر علوم کے آدمی ہیں اوران کے مباحث جو جدید تنقید کا پس منظر یا تناظر بنے ہیں، زیادہ تر فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام آدمی تو خیر کیا اچھے خاصے صاحبان علم بھی فلسفے کے مبدیانہ مباحث سے لاعلم ہیں۔ فلسفہ ایک علم کے طور پر ہمارے تعلیمی نصاب اور فلسفیانہ سوچ ہماری زندگیوں سے بطور ایک فکر کے خارج ہو چکی ہے۔ مغرب میں فلسفے کو ایک مضمون کے طور پر سکول کی سطح پر نصاب کا حصہ بنانے کی بات کی جا رہی ہے جب کہ ہمارے ہاں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی جیسے قدیم اور موقر اداروں میں ان شعبوں کو معاشرے کے لیے غیرافادی تصور کرتے ہوئے بند کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ فرانس میں سکول کی اعلیٰ سطح کی جماعتوں میں فلسفہ پڑھایا جا رہا ہے۔ جدید تنقیدی دنیا کے ایک اہم بنیاد گزار ژاک دریدا نے اپنے ایک انٹرویو میں ثانوی سطح سے بھی نیچے کے درجوں میں فلسفہ پڑھانے پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ

> ''جہاں تک فرانس کا تعلق ہے تو ۱۹۷۵ء میں ہمیں تشویش تھی کہ فرانس کے ہائی اسکولوں میں فلسفے کی درس و تدریس کو نہ صرف یقینی بنایا جائے بلکہ اسے وسعت بھی دی جائے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ فرانس اب دنیا کے ان چند ملکوں میں سے ہے جہاں دسویں جماعت کی سطح پر فلسفے کی تدریس کا انتظام موجود ہے۔ مگر ہماری خواہش یہ تھی کہ اس مضمون (فلسفہ) کو دسویں جماعت کے سالِ آخر سے پہلے طلباء سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان وجوہات کا بھی تجزیہ کیا جائے جس کے تحت ایک فرانس ہی کیا دیگر ممالک میں بھی ایک طویل عرصے تک یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ سولہ سترہ سال کی عمر سے کم کے طلباء کو فلسفے کی تعلیم نہ دی جانی چاہیے۔ یعنی فلسفے کے خلاف ان تعصّبات اور مفروضات کے پس پشت جو فکری یا معاشرتی یا سیاسی نوعیت کے عوامل کارفرما رہے ہیں ان کا سراغ لگایا جائے اور نوعمروں کو فلسفے کی

تدریس اور اس کی توسیع کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کا تجزیہ کیا
جائے کہ آخر ایسا کیوں ہے۔''(۳)

یوں ایسے معاشروں میں جنم لینے والے تنقیدی رجحانات جہاں فلسفے اور دیگر تہذیبی علوم کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب ہمارے جیسے فکری افلاس سے دوچار معاشروں میں پہنچتے ہیں تو ان کی تفہیم آسان نہیں ہوتی۔ فلسفے کی تعلیم سوال اُٹھانا اور سوچنا سکھاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس وقت جو فکری انتشار موجود ہے اس کا سب سے بڑا سبب تہذیبی علوم سے دوری کے علاوہ کچھ نہیں۔ جدید مغربی تنقید کے مباحث بالذات ناقابلِ فہم نہیں، انہیں ہمارا علمی پس منظر ہی ہمارے لیے قابلِ فہم بنانے سے قاصر رہتا ہے۔

۳۔ تنقید اور تخلیق کے درمیان ایک اٹوٹ تعلق ہمیشہ سے رہا ہے۔ تخلیق کار خود بھی تنقیدی شعور سے مالا مال ہوتا ہے لیکن تنقیدی روایت ہمیشہ ایک شفیق استاد کی طرح تخلیق کار کو نئی نئی راہیں دکھاتی رہتی ہے۔ اس سفر میں کبھی تنقید تکبر کا شکار ہو کر خود کو رشد و ہدایت کا منبع قرار دیتی رہی تو ردِ عمل میں تخلیق کار بھی اسے کارِ فضول قرار دیتا رہا لیکن عمومی طور پر تخلیق، تخلیق کار اور تنقید میں ایک مثبت رشتہ قائم رہا ہے۔ تنقید کی تاریخ کم و بیش یہی بتاتی ہے لیکن جدید تنقید نے پہلے تو مصنف کی موت کا اعلان کیا اور پھر تخلیق اور تنقید کے اس رشتے کو ختم کر دیا جس میں تخلیق کار تنقید سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ ساختیات نے سارا زور اس ساخت اور اہلیت / نظام کو دریافت کرنے پر صرف کر دیا جس میں کوئی فن پارہ جنم لیتا ہے۔ یوں ساختیاتی اور پس ساختیاتی تنقید فن پارے اور فن کار کی انفرادیت سے انکار کر کے دونوں سے ہی دُور ہوتی چلی گئی۔ جدید تخلیق کار نے اپنی موت کا اعلان سننے کی بجائے اس طرف سے اپنے کان ہی بند کر لیے۔ ضمیر علی بدایونی کی کتاب ''جدیدیت اور مابعد جدیدیت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے انتظار حسین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ان نظریات کے بارے میں ایک تخلیق کار کا نقطۂ نظر بھرپور انداز میں سامنے آتا ہے:

''ضمیر علی کا کہنا ہے کہ جدیدیت، کمیونزم کا وہ طویل بیانیہ ہے جو کہ اب اختتام کو پہنچا۔ ہم نے اس کی آخری جھلکیاں وجودیت میں دیکھی تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وجودی فلسفے میں جدیدیت نے آخری ہچکیاں لیں۔ ساختیات اور پس ساختیات نے غیر شخصی بیانیہ کے عقیدے کو پیش کیا۔ آدمی الگ ہو گیا۔ ان نظریات نے ادب میں ادیب کو مسترد کر دیا۔ صرف متن اہم ہے۔ لکھنے والا اضافی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ اسے نکال باہر کیا جائے۔ ایسے فلسفے میں صرف دانش وروں ہی کو دلچسپی ہوسکتی تھی۔ لہٰذا ساختیات اور پس ساختیات کے رو بہ رو بے چارہ ادیب، شاعر اور کہانی کار حواس باختہ نظر آتا ہے۔ وہ خود کو اس منظر نامے میں ٹاٹ باہر پاتا ہے۔ تخلیق کو تو نرا متن سمجھا جاتا ہے جس میں تخلیق کار کا کوئی حوالہ نہیں ہوتا۔ ایسا فلسفہ ادیبوں کو بھلا کس طور تحریک دے سکتا ہے اور کس طرح ادب میں نئے رجحانات کے لیے راہ ہموار کرسکتا ہے لہٰذا اس کی قسمت یہی ہے کہ یہ صرف تنقید کا نیا کلچر ہو کر رہ جائے۔'' (۴)

۴۔ اس سے اگلا مسئلہ اصطلاحات کا ہے۔ مولانا حالی اور اس کے معاصرین نے بہت واضح اصطلاحات وضع کیں۔ رومانوی، نفسیاتی اور مارکسی دبستان تنقید کی اصطلاحات بھی بہت جلد اُردو تنقید سے ایک مانوس رشتہ استوار کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ جدیدیت کی اصطلاحات کے تراجم میں بھی اکثر ناقدین متفق دکھائی دیتے ہیں لیکن جدید مغربی نظریات کی اصطلاحات اس طرز کی تنقید کے قاری کے لیے مسئلہ پیدا کردیتی ہیں۔ ان سرچشموں سے فیض اُٹھانے والے اُردو ناقدین ایک اصطلاح کے کسی ایک ترجمے پر متفق نہیں ہوسکے۔ یہی صورتحال مغربی اسماء الرجال کی بھی ہے۔ صرف دو تین مثالیں پیش کی جائیں گی۔

الف۔ ساختیاتی لسانیات کے سوئس بانی فرڈی نینڈ ڈی سوسیور کو کسی ناقد نے ساشیور لکھا، کسی نے اسے سوسیور پڑھا، کسی نے اس کی املا سوئسر کی، کسی نے سوشور۔ کسی کسی نے تو سوسر بھی لکھا ہے۔

ب۔ خود لفظ "Structuralism" کے لیے شمیم احمد (۵) اور شمس الرحمٰن فاروقی (۶) نے وضعیت، مظفر علی سید نے ایک جگہ ترکیبیت (۷) اور دوسری جگہ تشکیلیت (۸)، محمد حسن عسکری (۹) نے فلسفۂ ساخت اور بے شمار ناقدین نے ساختیات کا لفظ استعمال کیا۔ اگرچہ ساختیات کو بطور اصطلاح تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن اس حوالے سے ایک گنجلک پن ضرور موجود ہے۔

ج۔ دریدا کی معروف اصطلاح "Deconstruction" کا ترجمہ مظفر علی سید (۱۰) نے ''تشکیلِ نو''، ڈاکٹر وزیر آغا (۱۱) نے ''ساخت شکنی''، شمس الرحمٰن فاروقی (۱۲) اور نظیر صدیقی (۱۳) نے ''لاتشکیل'' جب کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (۱۴) اور عتیق اللہ (۱۵) نے ''ردتشکیل'' اور ڈاکٹر شارب ردولوی (۱۶) نے ''ردتعمیر'' کیا

ہے۔اس ضمن میں ایک وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بالعموم ان جدید نظریات میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کا اُردو ترجمہ کرنے میں دیگر ناقدین کی نسبت زیادہ کامیاب رہے ہیں لیکن اپنی اس اصطلاح "Deconstruction" کے حوالے سے جس شدت پسندی سے مرکز گریز انتشار کا کام لینا چاہتا ہے اس کی وضاحت لاتشکیل کے ذریعے ہی بہتر طور پر ممکن ہے۔ایک مترجم (۱۷) نے اس اصطلاح کا ترجمہ ''ردساختیات'' کیا ہے جو غلط ترین ہونے کے ساتھ ساتھ مترجم کی خود پسندی کا مظہر بھی ہے۔اصطلاح پسندی خود پسندی کی بجائے عوام میں اثر پذیری کی زیادہ رہینِ منت ہوتی ہے۔

۵۔ پچھلی تحریکوں سے تعلق رکھنے والے ادیب اور تخلیق کار معاشرے کے ساتھ ایک بامعنی رشتہ استوار کرنے کے مدعی تھے۔ترقی پسند تحریک نے اجتماعی سطح پر معاشرے کے اندر تبدیلی لانے کے لیے ادیب کی عملی جدوجہد میں شرکت پر زور دیا اور فیض کے ان لفظوں میں ترقی پسند تخلیق کار کا آدرش پوری طرح جھلکتا ہوا نظر آتا ہے کہ ''فنکار پر محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی فرض ہے۔'' (۱۸) وجودیت نے اجتماع کی بجائے فرد کی آزادی کا تصور پیش کیا۔ مغربی اور مشرقی دانش وروں میں پابلونرودا، کرسٹوفر کاڈویل، سارتر، ناظم حکمت، فیض، سجاد ظہیر اور سبطِ حسن کی عملی جدوجہد سے کون انکار کرسکتا ہے۔جدید فکری رویوں کے بنیاد گزاروں میں فوکو، ایڈورڈ سعید اور چومسکی وغیرہ کو چھوڑ کر باقی ناقدین تو ادیب کی ارادی معنویت کے قائل نہیں، کسی طرح کی عملی جدوجہد میں کیسے شریک ہوسکتے ہیں۔ یوں ان تنقیدی مباحث کے ذریعے تخلیق، تخلیق کار اور معاشرے کے درمیان کوئی بامعنی تعلق پیدا نہیں ہوسکا۔ یہ تنقیدی نظریات زیادہ سے زیادہ ایک ''سوڈو دانش ورانہ سرگرمی'' کے تاثر کو ہی پیدا کرسکے ہیں۔ان لوگوں کے خیال میں ادب کوئی سماجی/معاشرتی معنویت کی حامل تخلیقی سرگرمی ہی نہیں تو یہ معاشرہ کے اندر کسی بڑی تبدیلی کا محرک کیسے بن سکتی ہے۔ان تنقیدی نظریات نے ادب اور ادیب کی سماجی ذمہ داری سے انکار کی روش پر زور دیا تو ایک خاص طرح کے پیدا شدہ ردِ عمل نے ادب کے روایتی قاری کو ان نظریات کے قبول میں متذبذب رکھا۔

۶۔ دو تین اہم ناقدین کو چھوڑ کر اُردو میں ان مباحث پر قلم اُٹھانے والوں نے ان تنقیدی نظریات کا بلاواسطہ یا بالاستعیاب مطالعہ نہیں کیا۔اُنہوں نے ان موضوعات پر لکھتے ہوئے انگریزی زبان میں موجود ریڈرز یا پھر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر وزیر آغا کی کتب کو بنیادی ماخذ تصور کرتے ہوئے صرف انہی کے مطالعے پر اکتفا کی اور یوں ان ناقدین کے ہاں بالواسطہ مطالعہ نہ ہونے یا اس کی کمی کی وجہ سے یہ مباحث فکر (نظریہ) اور بیان (اُسلوب) دونوں حوالوں سے ان ناقدین کے ہاں مبہم اور گنجلک ہوتے چلے گئے۔ان تصورات پر لکھنے والوں نے مطالعے کی کمی کے

باوجود اپنے تھوڑے علم کی نمائش کو بھی ضرور سمجھا۔ یوں کئی مقامات پر ان نظریات کے اظہار میں مضحکہ خیز صورتحال بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان مباحث پر دو کتب تالیف کرنے والے یونس خان ایڈووکیٹ نے اپنی حالیہ کتاب ''جدید ادبی اور لسانی تحریکیں'' میں لکھا:

> ''سوئسر نے اپنے نظریۂ قرأت کو چومسکی کے نظریۂ اہلیت کی اساس پر قائم کیا ہے اس کے نزدیک کلام یا گفتار زبان کے نظام پر قائم ہے۔'' (۱۹)

اب اُن سے کون پوچھے کہ کیا ''سوسیور'' دوسری بار جنم لے کر ''نوم چومسکی'' کے نظریہ اہلیت (Competence) سے متاثر ہوئے، کیونکہ ان دونوں کے درمیان کم و بیش نصف صدی تو ضرور حائل ہے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے کہیں پڑھا ہوگا کہ جوناتھن کلر اپنی کتاب ''ساختیات کی لسانی اساس'' (The Linguistic Basis of Structuralism) میں سوسیور کے لانگ اور پیرول (Langue & Parole) کی بجائے چومسکی کے ''اہلیت'' (Competence) اور ''کارکردگی'' (Performance) کے نظریہ سے زیادہ متاثر تھا۔

اسی طرح رؤف نیازی کی ''مابعد جدیدیت۔ تاریخ و تنقید'' میں ایڈورڈ سعید پر لکھے گئے باب کو پڑھ کر فوراً ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُنہوں نے ایڈورڈ سعید کو بلاواسطہ نہیں پڑھا۔ ان کے بارے میں اِدھر اُدھر سے پڑھ کر کام چلانے کی کوشش کی ہے۔ (۲۰)

۷۔ مغرب میں جدید تنقیدی رجحانات کی پیش رفت بے حد تیز رفتار رہی ہے۔ بیسویں صدی کے آخری چار عشروں میں اسلوبیات، ساختیات، مابعد ساختیات، ردتشکیل، تانیثیت، نیو مارکسزم جیسے رجحانات بہت تیز رفتاری سے پیدا اور از کار رفتہ ہوتے رہے۔ ''فرینک کرموڈ'' نے اس ضمن میں بہت دلچسپ بات کی ہے کہ مغرب میں تنقیدی کتاب کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ابھی ایک رجحان اپنا اعتبار قائم کر رہا ہوتا کہ تنقید کی دنیا سے بے دخل بھی ہو جاتا ہے۔ اُردو کے جدید ناقدین اس تیز رفتار پیش رفت کا ساتھ نہیں دے سکے۔

۸۔ مغرب سے آنے والے جدید تنقیدی نظریات ایک دوسرے سے اس حد تک مختلف ہیں کہ بعض اوقات ان میں تضاد اور تخالف کا رشتہ پیدا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ساختیات اور ردتشکیل ایک دوسرے سے مختلف رجحانات ہیں جب کہ مابعد ساختیات اور مابعد جدیدیت مختلف النوع رجحانات کے مجموعے ہیں۔ اُردو کا جدید ناقد ایک ہی

سائنس میں ان رجحانات کا نام اس طرح لیتا ہے جیسے وہ ایک ہی لفظ کے مترادفات بیان کر رہا ہو۔ ایک ہی ناقد کے متفرق مضامین تو کیا ایک ہی مضمون پڑھیں تو یوں لگتا ہے کہ وہ بیک وقت ساختیاتی نقاد بھی ہے اور ردتشکیل فکر کا حامل بھی۔ اس صورتحال نے جدید اُردو تنقید میں بے حد اشکال پیدا کی ہیں۔ کچھ ناقدین نے اپنے تئیں اسے امتزاجی تنقید کا نام دے دیا ہے۔ بعض اوقات تو اس طرح کے دعوے بھی کیے جاتے ہیں کہ فلاں برس سے ہی فلاں نقاد کی تنقید میں امتزاجی مزاج موجود تھا۔ ان تنقیدی رجحانات کو معروف بنانے کی کوشش کرنے والے ایک جید نقاد نے لاشعوری طور پر اس امر کا اعتراف یوں کیا ہے:

> ''ساختیات اور پس ساختیات پر نظری مباحث زیادہ ہوتے ہیں، کہیں کہیں ساختیاتی تنقید کا عملی اطلاق بھی ہوتا ہے۔ میں خود امتزاجی تنقید Synthetic Criticism کا قائل ہوں۔ لہٰذا کسی تخلیق کو خالصتاً ساختیاتی حوالے سے دیکھنے کے بجائے اسے بطور تخلیق اہمیت دیتا ہوں اور اس کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اگر ساختیاتی حوالے کی ضرورت پڑے تو اسے بھی بروئے کار لے آتا ہوں۔ میرے نزدیک نفسیاتی، مارکسی، آرکی ٹائپل، اسلوبیاتی، اساطیری، ساختیاتی یا دیگر کسی حوالے کی طلب خود تخلیق کی طرف سے ہو تو بات بنے گی۔ ورنہ شعوری طور پر کسی خاص ڈسپلن کی مدد سے تخلیق کا جائزہ لینا تنقیدی افق کو محدود کر دے گا۔''(۲۱)

۹۔ ان تنقیدی رجحانات کی تشریح اور توضیح پر مبنی مضامین اور کتب تو کثرت سے سامنے آئیں لیکن عملی/اطلاقی تنقید کے نمونے بہت ہی کم سامنے آئے۔ جو دو چار مثالیں ملتی بھی ہیں، مثلاً ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، لنڈا ونٹک، ناصر عباس نیر اور سید عامر سہیل کے مضامین، تو یہ قاری کے سامنے کوئی نیا دریچہ وا نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر نارنگ صاحب کا مضمون ''فیض کو کیسے نہ پڑھیں'' کسی نئی بصیرت افروز دنیا میں لے جانے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کی قرأت کے بعد کوئی ایسا نیا وژن سامنے نہیں آتا جو اس سے پہلے فیض پر لکھی گئی تنقید میں موجود نہ ہو۔ یہی حال دیگر اطلاقی نمونوں کا ہے۔

۱۰۔ اُردو میں جدید تنقیدی نظریات کے شارحین کی زیادہ تعداد ترقی پسند ادب اور جدیدیت کی تحریک کو ناپسند

کرتی ہے جب کہ مغرب میں ان تنقیدی رجحانات سے متعلق زیادہ تر لوگ نئے یساری(New Left) ہیں۔اس تضاد کی وجہ سے بھی جدید اُردو کے ان ناقدین کے لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ فوکو، ایگلٹن ،ایڈورڈ سعید اور نوم چومسکی کے بارے میں کن ذہنی تحفظات کو سامنے رکھ کر ان کے نظریات کی شرح کریں۔

۱۱۔ ان نظریات نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی حامل تنقید کو تنقیدی منظر نامے سے ہٹانے کی کوشش کی تو ان تحریکوں کے نمائندہ ناقدین کی طرف سے بھی ان نظری مباحث کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔محمد حسن عسکری نے مذہبی طرزِ احساس اور خاص کر مابعدالطبیعات پر زد پڑنے کی وجہ سے ان نظریات کو رد کیا جب کہ فضیل جعفری، وارث علوی اور احمد ہمیش نے استہزائی رویہ اختیار کرتے ہوئے جارحانہ اسلوب میں اسے سامراج کی سازش قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر محمد عقیل اور ڈاکٹر محمد حسن ترقی پسند رویوں کے حامل ناقدین ہیں۔اُنہوں نے منطقی انداز میں ان نظریات کی شرح کرتے ہوئے انہیں استعمار کی ایسی خواہش قرار دیا جو ذہن انسانی پر قبضے اور نو آبادیاتی نظام کی نئ شکلوں کو متعارف کرانے کی خواہاں ہے۔مغربی استعمار ان نظری مباحث کو اپنا مقصد پورا کرنے کی خاطر ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔محمد حسن عسکری، احمد ہمیش اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے اقتباسات ملاحظ ہوں:

> ''جہاں تک زبان شناسی کا تعلق ہے تو آدمی اس کی جڑوں کو بھول کر جو برطانیہ کی منطقی اثباتیت اور ویانا کے مکتب فکر میں پیوست ہیں، صرف اپنے آپ کو خطرے میں ڈال سکتا ہے اور ان دونوں مکاتبِ فکر کی قوتِ محرکہ ان کے اس مراق میں مخفی تھی کہ کسی نہ کسی طرح مابعدالطبیعات کے امکان کو خارج کر دیا جائے۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک الہامی کتاب کو، بطور ایک الہامی کتاب کے کسی منطق کے زور پر اس قسم کی باز پرسی یا تفتیش کا ہدف بنایا جاسکتا ہے۔''
> (۲۲)

> ''ہاں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نشانیات اور ساختیات ہم معنی اصطلاحیں نہیں ہیں۔مزید یہ کہ بارتھ، دریدا اینڈ کمپنی نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس سوسیر کو بہانہ بنا کر نیز اس کی کلیدی اصطلاحوں مثلاً لانگ، پارول، معنی نما اور تصور معنی کی بیساکھیوں کی مدد سے جو

چھلانگیں لگائیں اور پھر جس طرح نشانیات کے ماہر سوسیر کو تمام
سماجی علوم کا سائنس داں قرار دیا اس کے پیچھے ایک اہم اور
خودغرضانہ مقصد بھی کارفرما تھا۔''(۲۳)

''اسٹرکچرل نفسیات اور لسانیات نے سرد جنگ میں پھنسے ہوئے
انسانوں کے لیے ایک ایسا مذہب تیار کیا ہے جو انہیں چیزوں کی
شیئت میں الجھا کر خود چیزوں سے الگ تھلگ کر دیتا ہے۔''(۲۴)

یہاں اس امر کی نشاندہی کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس سے مماثل صورت حال کا سامنا ساختیات کے تنقیدی دبستان کو خود مغرب میں بھی کرنا پڑا۔ ۱۹۸۰ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے انگریزی کے ایک اُستاد کولن میک کب کو ملازمت میں توسیع دینے سے اس لیے انکار کر دیا کہ وہ تدریس ادب میں ساختیات کے نظریۂ نقد کو فوقیت دیتا تھا۔ اس پر ساختیاتی نقادوں نے احتجاج کیا۔ اس واقعے پر ''ٹائمز لٹریری سپلمنٹ'' نے ایک خاص نمبر نکالا جس میں میک کیب کے واقعے کو بیان کرنے کے ساتھ ساختیات پر اعلیٰ قسم کے تعارفی مضامین بھی شائع ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ کولن میک کیب کو مارکسزم سے بھی علمی دلچسپی تھی۔ اُس پر فرانسیسی مفکر لاکاں کا زیادہ اثر تھا جو مارکسزم کی نفسیاتی تعبیر کا ماہر تھا۔ اس پر مارکس کے ساتھ ساتھ فرائڈ کے اثرات بھی نمایاں تھے۔

۱۲۔ مغرب میں ان جدید مباحث نے زیادہ تر یونیورسٹیوں میں فروغ پایا۔ ان نظریات کے پھیلاؤ میں امریکی اور فرانسیسی یونیورسٹیوں اور ان سے متعلق دانشوروں کا کردار مثالی رہا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم پر حکومتی قبضے اور ریاستی تسلط نے آزاد فکر اور روشن خیالی کو پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ نظریۂ پاکستان، اسلام اور پاکستانیت کی عجیب وغریب توضیح کرنے والے فکری افلاس اور تہی دماغ نام نہاد دانشوروں نے جو ہماری یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں سے منسلک تھے ان اداروں کو تحقیقی مراکز بنانے کی بجائے تشدد، بنیاد پرستی اور غلامانہ ذہنیت کا گھر بنا دیا ہے۔ ایسے میں جدید فکری رویوں اور تنقیدی رجحانات پر غور وفکر اور تحقیق ہماری یونیورسٹیوں کا خاصہ نہیں بن سکی۔ جب ہماری اکثر یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو کے نصابات کے دروازے منٹو، بیدی، فیض اور راشد پر بند ہیں تو وہاں سوسیور، لیوی سٹراس، ژاک دریدا، لاکاں، فوکو، فرانز فینن، ایڈورڈ سعید، نوم چومسکی اور ہومی بھابھا کس طرح بار پاسکتے ہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں میں کسی فکری تناظر یا ادبی جمالیاتی کے حوالے سے ادب کی پرکھ کی بجائے حب الوطنی اور غداری کے تناظر میں ادب اور ادیب کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ معاشروں پر ایسے برے وقت آیا ہی کرتے ہیں جب

نقاد تنقید لکھنے کی بجائے فتویٰ سازی کا آسان کام اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ یہ بظاہر اکیسویں صدی ہے لیکن اگر ہم غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہماری سانسوں میں جاری فکری تنفس کئی سو برس پرانا ہے۔ ہمیں آج بھی ایک ''نیاز'' اور ''نگار'' کی ضرورت ہے۔

ان اسباب و محرکات کی بناء پر جدید مغربی تنقیدی رویے اپنی کوئی مستند بوطیقا تشکیل دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کو نئی تنقیدی بوطیقا قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ حالی کے مقدمے کے ٹھیک ایک سو سال بعد نئی تھیوری اپنی تنقیدی بوطیقا پیش کر رہی ہے لیکن صورت حال یوں ہے کہ سو سال پہلے کا الطاف حسین حالی مفلر اوڑھے اپنا ''مقدمہ شعر و شاعری'' اُٹھائے اپنے معترضین کو مسکرا کے دیکھتے ہوئے فیض کی زبانی تنقید کی موجودہ صورت حال پر یوں تبصرہ کر رہا ہے:

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

حوالہ جات:

۱۔ نظیر صدیقی، معاصرانہ ادبی نظریات۔ ایک سیکنڈ ہینڈ مطالعہ، مشمولہ سوغات، بنگلور، پہلی کتاب، ستمبر ۱۹۹۱ء، ص ۳۹۸۔

۲۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، دیباچہ، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳-۱۴۔

۳۔ ژاک دریدا۔ ایک گفتگو، ترجمہ قاضی قیصر الاسلام، مشمولہ دریافت، کراچی، فروری ۱۹۹۲ء، ص ۲۵۔

۴۔ انتظار حسین، کتاب حاضر، مصنف غائب، مشمولہ مکالمہ کراچی، شمارہ ۶، ص ۲۸۰۔

۵۔ شمیم احمد، موجودہ عہد میں علوم بلاغت کی اہمیت، مشمولہ درسِ بلاغت، ترقی اُردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۹ء، دوسرا ایڈیشن، ص ۱۷۸۔

۶۔ فاروقی، شمس الرحمان، پس نوشت: شعر، غیر شعر اور نثر، مشمولہ مکالمہ کراچی، شمارہ ۳، ص ۱۶۲۔

۷۔ مظفر علی سید، تعارف و ترجمہ، تفسیر قرآن اور فلسفۂ جدید از محمد حسن عسکری، معاصر، لاہور، شمارہ ۲، ص ۶۵۹۔

۸۔ مظفر علی سید، تنقید کی آزادی، دستاویز، لاہور، سن ندارد، ص ۳۳۵۔

۹۔ محمد حسن عسکری، جدیدیت، آبِ حیات، راولپنڈی، ۱۹۷۹ء، ص ۸۷۔

۱۰۔ مظفر علی سید، بحوالہ سابقہ، ص ۳۳۵۔

۱۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، دستک اس دروازے پر، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۷۔

۱۲۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۷۔

۱۳۔ نظیر صدیقی، بحوالہ سابقہ، س ۴۱۸۔

۱۴۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بحوالہ سابقہ، ص ۲۰۴۔

۱۵۔ ڈاکٹر عتیق اللہ، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، اُردو مجلس، دہلی ۱۹۹۵ء، ص ۵۸۱۔

۱۶۔ ڈاکٹر شارب ردولوی، آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تنقید، اُردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۴۔

۱۷۔ کاشف بلوچ، ژاک دریدا، ردِ ساختیات اور معاصر اُردو تنقید، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔

۱۸۔ فیض احمد فیض، ابتدائیہ، دستِ صبا، مشمولہ نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۳۔

۱۹۔ یونس خان ایڈووکیٹ، جدید ادبی اور لسانی تحریکیں، دُعا پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۔

۲۰۔ رؤف نیازی، مابعد جدیدیت، تاریخ و تنقید، حلقہ آہنگ نو، کراچی، ۲۰۰۳، ص ۱۰۰–۱۱۰۔

۲۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ایک نجی خط سے اقتباس، مشمولہ سوغات بنگلور، پہلی کتاب، ستمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۸۔

۲۲۔ محمد حسن عسکری، تفسیر قرآن اور فلسفۂ جدید: تعارف و ترجمہ، مظفر علی سید، معاصر، لاہور، شمارہ ۲، ص ۶۶۵۔

۲۳۔ فضیل جعفری، بحوالہ اداریہ تشکیل کراچی، شمارہ ۳۶ تا ۳۹، ص ۱۸۔

۲۴۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، نشانات، ادارۂ عصرِ نو، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۹۔

۲۵ Raman Selden, A Reader's guide to Contemporary Literary Theory, The Harvester Press, Sussex, 1985, P.1,2.